RAHAT-UL-QULOOB

Bi-Annual, Trilingual (Arabic, English, Urdu) ISSN: (P) 2025-5021. (E) 2521-2869

Project of **RAHATULQULOOB RESEARCH ACADEMY,**

Jamiat road, Khiljiabad, near Pak-Turk School, link Spini road, Quetta, Pakistan.

Website: www.rahatulquloob.com

Approved by Higher Education Commission Pakistan

Indexing: » Australian Islamic Library, IRI (AIOU), Tahqeeqat, Asian Research Index, Crossref, Euro pub, MIAR, ISI, SIS.

TOPIC

دینی مدارس کی معاشرتی حیثیت اوران کے ذرائع معاش

The Social status of Madaris and their sources of economy

AUTHORS

1. Masooda Shah, Ph.D Scholar, Department of Islamic Studies, University of Balochistan, Quetta. Email: masoodashah97@gmail.com
2. Prof. Dr. Abdul Ali Achakzai, Professor/Chairman Department of Islamic Studies, University of Balochistan, Quetta.
   Email: abdulali.uob@gmail.com

How to Cite: Shah, Masooda, and Prof. Dr. Abdul Ali Achakzai. 2021. “URDU: دینی مدارس کی معاشرتی حیثیت اوران کے ذرائع معاش: The Social Status of Madaris and Their Sources of Economy”. *Rahatulquloob* 5 (2), 47-61. https://doi.org/10.51411/rahat.5.2.2021/298.

URL: http://rahatulquloob.com/index.php/rahat/article/view/298

Vol. 5, No.2 || July–Dec 2021 || URDU-Page. 47-61

Published online: 05-07-2021

QR. Code

دینی مدارس کی معاشرتی حیثیت اوران کے ذرائع معاش

The Social status of Madaris and their sources of economy

[1]مسعودہ شاہ، [2]عبد العلی اچکزئی

ABSTRACT

Madrassahas have played a vital role in educating the Muslims with Islamic teaching or enabling them to lead their life according to Islam. These steps compelled the common people to send their children to institutes or field where they are guaranteed an earning future. Madrassahs continued their existence the courage of devoted Islamic scholars and the aids/Zakat, Khairat of common people. Even after the partition of subcontinent Government did not consider any financial support for Madrassahs. Even today the system is not accepting the value of Madrassahs in our society.So that there was both religious and financial attractions studying and being an Islamic to serve.As result madrassah are producing long quality of Islamic scholars and no means of earnings or no skills required for earning financial survival in our society.

Keywords: Madaris, Islamic Teachings, financial support, financial survival, Society.

ارشاد خداوندی ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا وَّ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ[1]

ترجمہ: اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جانوں کو اور اپنے گھر والوں کو ایسی آگ سے جس کا ایندھن (یہ لکڑی نہیں) آدمی اور پتھر ہیں تو اس آگ سے بچاؤ کا ذریعہ ہے دین اور دین کی تعلیم جو کفر و ایمان کا فرق بتاتی ہے۔ توحید و شرک کا فرق، حلال و حرام کا فرق، جائز و واجب کا فرق اس کے لیے مسلمان معاشروں میں مدرسے قائم ہوئے ہیں۔ اگر کسی ملک میں دین تسلسل کے ساتھ اور پائیدار طریقہ سے باقی رہ سکتا ہے تو وہ دینی تعلیم سے ہی باقی رہ سکتا ہے ورنہ مشاہدہ یہی ہے کہ جن ملکوں، جن علاقوں میں دینی تعلیم کا سلسلہ بند ہو گیا وہاں اسلام بالکل ختم ہو گیا۔ مولانا عبد الہادی مدارس کی اہمیت اپنی کتاب میں یوں بیان کرتے ہیں: ''اسپین جو اسلام کا اتنا بڑا مرکز تھا کہ امام مالکؒ کے ماننے والے مالکیہ اہل قرطبہ کا عمل حجت مانتے ہیں، کوئی یہ کہہ دے کہ قرطبہ والے ایسا کرتے ہیں، تو معلوم ہوا کہ یہ دینی بات ہے۔ وہاں جب اسلام کے مخالفین کا غلبہ ہوا تو انہوں نے دینی تعلیم بند کر دی۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ لوگ چھپ چھپ کر اپنے بچوں کو دینی کتابیں پڑھاتے تھے۔ الف، بے کے حرف سکھاتے تھے اور چھپ کر نکاح ہو تا تھا۔ اس کی اجازت نہیں تھی کہ کسی کھلی جگہ کھل کر یا کسی کمرہ میں علانیہ اسلامی طریقہ پر نکاح ہو، عیسائی طریقہ پر ہو جاتا تھا پھر الگ جا کر اسلامی طریقہ پر ہوتا تھا، تاکہ وہ حلال ہو۔ چنانچہ اسپین کا وہ حال ہوا کہ بقول علامہ اقبالؒ کے ع

آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں۔[2]

فضا بے اذاں نہیں، اور زمین ہے لیکن سجدہ نہیں کان ترستے ہیں اذان کو وہاں۔

یہ ہے اہمیت مدارس کی جو اسلامی معاشرے کی اساس ہیں ان مدارس پر بحث سے پہلے ان کی اہمیت کا مفہوم دو لفظوں ''نیابت انبیاء'' سے ادا کیا جا سکتا ہے، کچھ پیغمبروں ہی کی سی جدوجہد اور قربانی چاہتے ہیں۔

حدیث العلماء ورثة الانبیاء[3] کو حدیث ان أشد الناس بلاءً الأنبیاء ثم الأمثل فالأ مثل[4] کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے اہمیت علم واضح ہوتی ہے۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ مدرسہ کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں: "مدرسہ سب سے بڑی کارگاہ ہے جہاں آدم گیری اور آدم سازی کا کام ہوتا ہے۔ جہاں دین کے داعی اور اسلام کے سپاہی تیار ہوتے ہیں۔ مدرسہ عالم اسلام کا بجلی گھر یا ورہاؤس ہے۔"[5]

لفظ مدرسہ "المدرس" جس کا تدریس کی جگہ پر اطلاق ہوتا ہے۔ "درس" مادہ سے مشتق ہے اسی طرح مدارس کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے وہ جگہ جہاں لوگ درس پڑھیں اور وہ گھر جہاں لوگ قرآن پڑھیں۔[6]

صاحب اللسان العرب کے بقول اس لفظ کا "فعال کے وزن پر اسم مکان کے لیے انا، ایک غریب (نامانوس) وزن ہے۔[7] دائرہ معارف اسلام میں مقالہ مسجد کے تحریر کنندہ کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ لفظ اپنی اصل کے لحاظ سے عربی یا سامی نہیں قاموس سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ مدارس وہی (مکتب خانہ) ہے یعنی یہ لفظ عبرانی ہے۔ اسلام سے قبل اور پیغمبر اسلام کے دور میں تعلیمات مراکز کو اس نام سے مختص نہیں کیا گیا تھا۔

دراصل مدرسہ اپنے سے پہلے کی تمام اسلامی تعلیمات کے مظاہر کا نتیجہ ہے ان مظاہر میں ایک تو مساجد تھیں کہ ان کی خصوصیات "مدرسہ" میں محفوظ رہیں۔ دوسرے دارالعلوم تھے کہ مدارس میں کتاب خوانوں کا قیام انہی سے ماخوذ ہے۔ مدارس ان بے شمار کوششوں کا نتیجہ تھے جو مسجد سے باہر تعلیمی کارکردگی کے لیے کی گئیں۔ مدرسہ سے پہلے کے مراکز میں جو نقائص رہ گئے تھے مدرسہ کے قیام سے ان کی تلافی ہو گئی مدرسے کے فروغ سے تعلیم و طلبہ کی توجہ حاصل کرنے کے مخصوص ادارے تھے۔ ان میں طلبہ کو رہائش کی سہولت فراہم کی جاتی تھی ،علم پھیلایا جاتا تھا اور طلبہ تک ان کی دسترس کو یقینی بنایا جاتا تھا[8]۔ مدرسہ ایک فکری مظہر ہے اس کی ایجاد اور پیدائش کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ پانچویں صدی ہجری سے ذرا پہلے اور اس کے وائل میں یہ لفظ رائج و متداول ہوا، جیسا کہ امام منصور ثعالبی(۴۲۹ھ) کا تعلق نیشاپور سے ہے۔ اس شہر کے لوگوں کو دیگر اسلامی شہروں پر تعمیر میں سبقت حاصل ہے۔ امام موصوف اپنی کتاب "نخبۃ اللہ" میں لکھتے ہیں: المدرس مکان درس الکتب یعنی مدرس کتابیں پڑھنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔[9] مندرجہ بالا حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ:

1: اسلام میں آنحضرت ﷺ کے دور میں مسجد کو تعلیم کے ایک اصلی مرکز کی حیثیت حاصل تھی تاہم آپؐ مسجد کے علاوہ دیگر مقامات پر جا کر یا جہاں لوگ آپ کے ارد گرد اکٹھے ہو جائیں تعلیم کا فریضہ ادا کرتے تھے۔ (جبکہ تعلیماتی مراکز مدرسہ کے نام سے کوئی وجود نہیں رکھتے تھے۔)

2: پہلی صدی ہجری میں تعلیمی مسائل پر کام کرنے والوں اور علماء دین نے عمومی تعلیماتی مراکز کے ساتھ خصوصی تعلیماتی مقامات کے وجود کی ضرورت کا احساس کیا ان کا خیال تھا کہ تعلیم کے سلسلہ میں صرف مسجد پر ہی انحصار نہیں کرنا چاہیے۔

3: مدرسہ کا شمار چوتھی صدی ہجری کی ایجادات میں ہوتا ہے تاہم یہ علمی آموزش مظہر در حقیقت بہت سے ان اقدامات کا نتیجہ تھا جو چوتھی صدی ہجری سے پہلے اٹھائے گئے تھے۔[10]

تیسری صدی میں ایک مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ: بغداد میں تین ہزار مساجد ہیں۔" پانچویں صدی ہجری میں ایک اندلسی سیاح ابن جبیر

بیان کرتا ہے کہ اسکندریہ (مصر) میں ۱۲ ہزار مساجد ہیں۔ اس سے مدارس کی تعداد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے تاہم کسی دور میں بھی مدرسہ اور مسجد کا تعلق ختم نہیں ہوا۔[11]

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار کے مطابق پہلا مستقل مدرسہ الحاکم نے 390ھ میں بنایا جسے وہ "دارالحکمۃ" کہتا تھا۔ الحاکم چونکہ فاطمی تھا اس لیے شعبہ نظم میں "دارالحکمۃ" یا دارالعلم کی اصطلاح علمی ادارے کی حیثیت سے چل نکلی۔ ڈاکٹر احمد شبلی اپنی کتاب تاریخ تعلیم وتربیت میں لکھتے ہیں: "ضرورت زمانہ اس کا باعث تھی۔ عراق، شام اور مصر میں بویہ اور فاطمی خاندان کو اقتدار حاصل تھا۔ چونکہ دونوں خاندان عقائد کے لحاظ سے شیعہ تھے لہٰذا وہ شیعہ مذہب کی تبلیغ کرتے تھے۔ البتہ بعد میں سلجوقی اور ایوبی خاندانوں نے ایسے مدارس قائم کیے جہاں دین حق کی صحیح تعلیم دی جاتی تھی۔[12]

مدارس اور معاشرتی چیلنجز:

قُلۡ اَرَءَيۡتَكُمۡ اِنۡ اَتٰٮكُمۡ عَذَابُ اللّٰهِ اَوۡ اَتَتۡكُمُ السَّاعَةُ اَغَيۡرَ اللّٰهِ تَدۡعُوۡنَ‌ ۚ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ[13]

ترجمہ: کہو کہ کیا تم نے غور کیا اُن چیزوں پر جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو مجھے دکھاؤ کہ انہوں نے زمین میں کیا بنایا ہے یا آسمانوں میں اُن کی کچھ شرکت ہے۔ میرے پاس اس سے پہلے کوئی کتاب لے آئو یا کوئی علم جو چلا آتا ہو، اگر تم سچے ہو۔

مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس آیت میں دو قسم کے علم کو بطور مستند علم Knowledge Authority تسلیم کیا گیا ہے...ایک علم نقلی اور دوسرا علم عقلی۔ علم نقلی سے مراد جو مبنی بروحی ہے اور علم عقلی سے مراد وہ علم ہے جو عقل انسانی پر مبنی ہو۔ تاہم علم عقلی سے مراد صرف وہ علم نہیں ہے جو عباسی دور کے معتزلہ و متکلمین کے درمیان پایا جاتا تھا بلکہ توسیعی طور پر اس سے مراد سائنسی دور کا جدید علم بھی ہے جس کو علم یا Rational Knowledge کہا جاتا ہے۔

برصغیر میں انگریزوں کے آنے سے پہلے خانقاہیں، مکتب اور مدارس موجود تھے۔ تین صدیاں پہلے ان مدارس میں منقولات اور معقولات طرز طریق سے تعلیم دی جاتی تھی۔ منقولات میں علمی و مذہبی تعلیمات شامل تھیں جبکہ معقولات میں رمانے کے جدید علوم شامل تھے یہ علما اور دانش مند پیدا کیا کرتے تھے۔ ہر مدرسہ کا نصاب دوسرے سے قدرے مختلف تھا۔ 1693ء میں فرنگی محل لکھنؤ میں جو مشہور مدرسہ قائم کیا گیا اس میں صرف، نحو، منطق، حکمت، حساب، فقہہ، بلاغہ، کلام، اصول آل فقہہ، تفسیر اور حدیث پڑھائے جاتے تھے۔ لکھنو کا یہ مدرسہ فقھ کی ایک عظیم درسگاہ تھی۔ اس کے متوازی، شاہ ولی اللہ کا مدرسہ "حدیث" کی بہت بڑی یونیورسٹی تھا۔

اس کے علاوہ خانقاہیں آج کے لحاظ سے تعلیم کا آخری درجہ تھا! جہاں شریعت و طریقت کے اعلیٰ پائے کے صوفی بزرگ ان طلباء کو تراش کر ہیرا بنادیتے تھے۔ یہ امر شاید آج کل کے تعلیمی نظام کے مقابلے میں باعث حیرت ہوگا کہ اس وقت کی مسلمان حکومتوں اور ان تمام درسگاہوں میں انتہائی قربت کارشتہ تھا(موجودہ حکومتیں و مدارس کی بداعتمادی کی فضا کے مقابلے میں)۔ صورت حال میں تبدیلی اس وقت واقع ہوئی جب ایسٹ انڈیا کمپنی برصغیر پر قابض ہوئی۔ اس کے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے دو اہم فیصلے کیے: ایک تو تمام مسلمان مدارس، مکاتب اور خانقاہوں سے منسلک جائیدادوں کو اس بنیاد پر ضبط کر لیا گیا کہ کمپنی کے منافع کے محصولات میں کمی آرہی ہے۔ دوسرا فیصلہ یوں کیا کہ پورے

ملک کی سرکاری زبان انگریزی قرار دے دی گئی۔ اندازہ کیجیے اس وقت کے عالم لوگ اس وقت جہلا کی فہرست میں آگئے اور ساتھ ساتھ تمام تعلیمی ادارے اپنی جائز آمدنی سے محروم ہوگئے۔ اس وقت مسلم تعلیم کو سہارا دینے والے عوامل کے بارے میں اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں:

1: حکومت علماء وفضلاء کی پرورش کے لیے نقد روپیہ اور اراضی کی امداد دیتی تھی، جو انہیں مالی تفکرات سے سبکدوش کر دیتی تھیں۔

2: واقف، حکمرانوں یا دوسرے متمول لوگوں نے متعدد اوقاف قائم کرر کھے تھے۔

3: پھر اجتماعی جدوجہد سے بھی امداد ہوتی تھی۔ جس میں کسی مکتب و مدرسہ کو چلانے کے لیے بالعموم حسب استطاعت چندے کیے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی زوال کے باوجود مسلمانوں کے ہاں علمی مشاغل زوروں پر رہے۔[14]

سید محمد سلیم لکھتے ہیں: ''مسلمانوں کا نظام تعلیم حکومت کی مداخلت سے آزاد ایک خودکار نظام تھا جو اوقاف اور معافیوں کی آمدنی سے چلتا تھا۔ ملک کے سارے حصے میں ایسے اوقاف موجود تھے ہر جگہ مدارس بھی موجود تھے۔ نئی نسلوں کی تعلیم وتربیت کا کام بغر کسی خلل اندازی کے تسلسل کے ساتھ یا انقطاع کے بغیر جاری رہتا تھا، ہزاروں علماء، مشائخ شعبہ تعلیم سے وابستہ تھے، فکر معاش سے آزاد اس کار عبادت میں مشغول رہتے تھے مگر انگریزوں نے نظام تعلیم کو نیست ونابود کر دیا اور تعلیم کے لیے وقف زمینوں کو 1838ء میں سرکاری قبضہ میں لے لیا''[15]

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ اس وقت کے حالات کو آنکھوں دیکھے لوگوں کی زبانی یوں لکھتے ہیں: ''ابو المنصور جنگ (والی اودھ) کی وزارت کے بعد جہاں کہیں وظائف و جاگیروں کا تسمہ بھی لگا ہوا تھا، اسے بھی کاٹ دیا گیا۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان بے چاروں پر کیا گزری ہو گی اور ان کو سوچنے کی ضرورت ہے۔ میکالے کی تعلیمی رپورٹ میں جب مشرق اور مشرق کے سارے علمی مجاہدات کو یورپ کی کتابوں کی ایک الماری کے برابر ماننے سے انکار کیا گیا تھا۔ اسی بنیاد پر قدیم تعلیم کا سارا نظام چانک بدل گیا اور ہم جاہلوں کو تہذیب وتمدن کی روشنی میں لانے کے لیے کلیات وجوامع (کالج ویونیورسٹی) کے جال ملک میں پھیلا دیئے گئے۔''[16]۔ آگے لکھتے ہیں کہ: ''یہی وجہ ہے کہ جب علم وفضل کی راہوں سے معاش کے جو ذرائع مہیا ہوتے تھے وہ مسدود ہو گئے تو لوگوں کو پیشہ سپہ گری کا اختیار کرنا ہی آسان معلوم ہوا لیکن ظاہر ہے جس کے پشت ہا پشت سے پڑھنے پڑھانے، تعلیم وتعلم کا سلسلہ جاری رہا ہو ان کے سارے خاندانوں کا علم سے ناطہ ٹوٹ کر ایک ایسے پیشے کو اختیار کر لینا علم سے جس کا دور کا بھی تعلق نہیں ہو، آسان نہ تھا، لیکن غرباء ومساکین کے عام طبقہ کے سوا خاندان کے کچھ علماء ومشائخ کسی طرح یہ تعلیم کی گاڑی گھسیٹے لیے جارہے ہیں۔''[17]

اس قسم کی دینی درسگاہوں کو اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے عوامی چندوں پر انحصار کرنا پڑا۔ اس غیر یقینی صورت حال کو فطری طور پر علماء کی پریشانی کا موجب ہونا چاہیے تھا۔ لیکن یہ حضرات توکل علی اللہ، کامل استقلال سے مصروف عمل رہے۔ زمانے کی سختی، گرمی انہیں جادۂ عمل سے متزلزل نہیں کر سکی۔ اس مالی غیر یقینی کی کیفیت کے بارے میں دارالعلوم دیوبند کے محترم مؤسس حضرت مولانا محمد قاسم نانا تویؒ کی بلند پایہ وصیت قابل غور ہے۔[18]

اس بے سروسامانی کے باوجود انہی مدارس کا فیض ہے کہ ملک میں اللہ اور رسول ﷺ کے نام کا چرچا ہے۔ حق وباطل کا امتیاز قائم ہے۔ دینی شعائر واحترام کا تصور موجود ہے۔

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے

کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا[19]

موجودہ مدارس کے لیے فراہمی مالیات کا مسئلہ:

مدارس کے درجہ بالا پس منظر سے وضاحت ہوتی ہے کہ انگریزوں کی حکومت میں جب مدارس کی سرپرستی حکومت نے چھوڑ دی اور ہر قسم کے تعاون وقف سے محروم کر دیا گیا اس روش کو آج تک مدارس کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے۔ لہٰذا مدارس کے لیے مالیات کی تحصیل کا مسئلہ سب سے پیچیدہ مسئلہ ہے۔ مدارس کو ایک طرف اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے فراہمی مالیات کی کوشش کرنی پڑتی ہے اور ساتھ میں اپنے تعلیمی معیار کو بھی قائم رکھنا ہوتا ہے۔ مولانا ابو عمار زاہد الراشدی مدارس کی تاریخ یوں لکھتے ہیں: تقریباً ۹۰ برس تک ان مدارس نے مسلم معاشرے میں دینی رہنمائی اور علمی ضروریات کی فراہمی کے علاوہ مسجد و مکتب کا ادارہ قائم رکھنے کے لیے رجال کار مثلاً خطیب و مدارس، قاری، حافظ اور مفتی مہیا کیے۔ اس عظیم الشان خدمت سے معاشرے میں مسجد و مکتب کا نظام قائم رہا اور اس حوالے سے مسلمانوں کی ضروریات کی فراہمی کا مسئلہ تعطل کا شکار نہیں ہوا۔ برطانوی مقبوضہ ہندوستان میں دینی مدارس کا یہ دور "تحفظاتی دور" کہلاتا ہے۔ جس میں انہیں خود کو ریاستی مداخلت سے بچانا تھا۔ چنانچہ پوری بصیرت عملی کے ساتھ دینی مدارس کا یہ نظام خود کو سادگی، قناعت اور ایثار کے دائروں میں محدود رکھتے ہوئے کام کرتا رہا۔ مگر 1947ء میں قیام پاکستان میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ نئی ریاست کا نظام تعلیم ۱۸۵۷ء کے بعد کے ماحول میں محصور رہنے کے بجائے اس سے قبل کے دور میں واپس چلا جاتا یا دینی مدارس کو آزادانہ نظام تعلیم کے اہداف میں وسعت دے کر شامل کر دیا جاتا تاکہ ان مدارس سے دینی و معاشرتی ضروریات کے ساتھ قومی و ریاستی ضروریات کو بھی پورا کیا جاتا مگر افسوس کہ نہ نئے قومی نظام تعلیم کی طرف پیش قدمی میں مدارس کو شامل کیا گیا اور نہ ہی دینی مدارس نے اس تبدیلی کے تقاضوں کو محسوس کیا۔ اس لیے سامراجی دور کی نوآبادیاتی تعلیمی و ریاستی پالیسیوں کا تسلسل بدستور جاری رکھا گیا جو آج تک جاری ہے۔ دوسری طرف خود دینی مدارس نے یہ سوچ کر انہیں راستوں پر چلتے رہنے میں عافیت محسوس کی کہ جب دوسری طرف کوئی تبدیلی نہیں آرہی تو ہم خود کو اپنے پرانے "ٹریک" سے ہٹا کر نئے خطرات کیوں مول لیں۔"[20]

اصولی بات یہ ہے کہ ہمارے حکمران آج بھی نظام تعلیم میں مدارس کو وہ اہمیت نہیں دیتے بلکہ تعلیم کے بجٹ اور پالیسیوں کی بات کرتے ہوئے انہیں کبھی مدارس کا خیال نہیں آتا کیونکہ اُن کے خیال میں اس کام کے لیے حکومتوں پر علماء کو انحصار ہی نہیں کرنا چاہیے۔ زمینی حقائق بھی یہیں ہیں کہ علماء عوام کے تعاون سے دینی مدارس کی روایت جاری رکھئے ہوئے ہیں۔ آج اگر مدارس کے داخلی ماحول کی بات ہر طرف زبان زد عام ہے تو وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اکثر مدارس (ماسوائے چند) کسمپرسی کا شکار ہو گئے ہیں۔ نظام تعلیم کا آغاز مدرسہ کی چار دیواری سے ہوتا ہے مگر مدارس کی ہیئت کسی درسگاہ کا توڑ پیش نہیں کرتی جہاں علم و دانش سے وابستہ دلچسپی کا مواد موجود ہو۔ جہاں سے دینی علم کے پانے کے ادارے کو مزید تقویت پہنچے۔ مگر وہاں صرف تعلیم ہی ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔ وہ طلبہ جو کل معاشرے کا "مقتدیٰ و پیشوا" بن کر آئیں گے تو ان کو مدارس کے ماحول نے وہ اعتماد نہیں دیا ہوتا جو کسی عصری تعلیمی ادارے نے اپنے طالب علموں کو دیا ہوتا ہے۔ کیونکہ پاکستان کی زیادہ تر آبادی غریب ہے

اور وہ تعلیمی اخراجات تو کجا ضروریات زندگی بھی پورا کرنے سے لاچار ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان مدارس کا رخ بھی غریب عوام ہی کرتی ہے جہاں بچوں کی تعلیم و تربیت مفت ہوتی ہے بلکہ رہائش و طعام کا مسئلہ بھی بخوبی حل ہو جاتا ہے۔

پاکستان کے تمام اخبارات میں مفتی منیب الرحمن" سربراہ اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ "کا یہ بیان شائع ہوا کہ...:"غربت بڑھتی ہوئی آبادی کے باعث ملک میں مدارس اور طلباء کی تعداد میں اضافہ۔"[21]۔ اخبار کی اس خبر کے مطابق رواں سال طلباء کی تعداد میں 10 فیصد اضافہ ہوا ہے کیونکہ یہ لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے۔ جس کی وجہ سے مدارس کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ مولانا گلزار احمد مظاہریؒ نے اپنے ایک انٹرویو میں یہ بات کہی کہ:

"ایسے افراد جو سماجی رتبے اور خاندانی روایات کی وجہ سے صاف ستھرے اور اعلیٰ عادات کے مالک ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس طرف آنا چھوڑ دیا ہے۔ ان مدارس میں طلبہ کے کھانے پینے کا نظام جس ڈھب پر چلتا ہے۔ طلبہ گھروں سے روٹیاں مانگ کر کھاتے ہیں۔ جن مدارس میں کھانا پکانے کا بندوبست ہے وہ بھی کوئی مناسب نہیں، مدارس کا مہتمم طلبہ کے سامنے مساجد کے اندر نمازیوں سے اُن کے لیے چندے مانگتا ہے۔ اس طرح طلبہ کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے اور وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو کر جو کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ بھی نہیں کرسکتے۔"[22]

مزید برآں اس حوالے سے بہت کچھ ذلت و حقارت بھی برداشت کرنا پڑتی ہے اور ان چیزوں میں بعض دفعہ چندے کے حصول میں مہتمم، اساتذہ اور طلبہ کو عملی طور پر کردار بھی ادا کرنا پڑتا ہے جس چیز نے مسلمانوں کے درمیان مدارس کی "شبیہ" کو خراب کرنے میں بنیادی اکردار ادا کیا ہے۔

چندے کا حصول اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کی رائے:

حقیقت یہ ہے کہ مدارس کے بعض حلقوں میں چندے کے تعلق میں بے احتیاطی برتی جاتی ہے۔ البتہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ اکثر مدارس پر عوام اپنے اعتبار سے خود مالی اعانت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ جہاں لوگ علماء پر اعتماد اور مسجد و مدارس کے قلبی تعلق کی بناء پر روپیہ پیسہ لا کر دیتے ہیں۔ دینی مدارس کے نظام پر اصحابِ خیر کا یہ اعتماد ان کی بقاء و تسلسل کا باعث ہے اور مدارس کی سادگی، قناعت، خلوص اور جہد مسلسل نے ہی یہ اعتماد قائم رکھا ہے۔ مگر کہیں یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض حلقوں میں ان تقاضوں کے زمرے میں ایسے حیلے حوالے تراشے جاتے ہیں کہ ان سے روح شریعت کانپ جاتی ہے۔ ایک طبقہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ مدارس کو کاروبار کا ذریعہ بنا رہا ہے۔ اس لیے اس پہلو پر غور و فکر ضروری ہے۔ دنیا و آخرت پر ترجیح دینے والے یہ لوگ چاہے جس قماش کے بھی ہوں چونکہ وہ علماء کے ہی بھیس میں ہوتے ہیں۔ اس لیے عوام جعلی اور اصلی، مصنوعی اور حقیقی کا فرق سمجھ نہیں پاتے۔ اس طرح خدمت دین میں مشغول اجتماع کے مستحق ادارے خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں جبکہ خانہ دار اداروں کی جھولیاں "لباب" رہتی ہیں۔ چندے کی تحصیل کے سلسلے میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نہایت محتاط اور حساس رویہ رکھتے تھے۔ چندے کی مروجہ روش اور چندہ اکٹھا کرنے والوں کے طور طریقوں سے وہ اس حد تک نالاں اور آزردہ تھے کہ بعض لوگوں نے ان کی اس سلسلے میں کی گئی تنقیدوں کو شدت کی بناء پر سرے سے چندے کی مخالفت پر محمول کیا ہے۔ مولانا تھانویؒ کے نزدیک چندہ وصول کرنے کے لیے تین شرائط کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

دباؤ نہ ہو۔ دوسرا خوشامد نہ ہو اور نہ ایسا طرز کہ جس سے دین کی تحقیر ہو، اور چندہ وصول کرنے والا وعظ نہ کہے۔ فرماتے ہیں آج کل زیادہ تر چندے کے طریقہ حرام ہی ہیں۔ مگر مخلصین" چندہ" اس کو دین سمجھتے ہیں۔ کچھ نہیں اس کا نام تو بے حسی کا حال یہ ہے کہ مال کے واسطے نہ آبرو کی پرواہ نہ دین کی۔"[23]

بہر حال دینی مدارس کو"اپنوں اور غیروں" کے درمیان اپنے انتظامی امور کو شک وشبہ سے بالاتر رکھنے کے لیے چندہ کی تحصیل کے طریقوں میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ اور دین کے ذریعے دنیا خریدنے والوں کے اس عمل کو محفوظ کیا جاسکے. ورنہ مدارس سے وابستہ علمائو فضلاء کا وقار آنے والے دنوں میں دائو دپر لگ جائے گا۔ عوام کا ذہن اس تعلق سے اس قدر خراب ہو چکا ہے کہ وہ علماء کی خوشحالی کو چندے کے علاوہ کسی اور تناظر میں نہیں دیکھ سکتے۔ لہٰذا چندے کے معاملات کو معاشرے میں کمزوریوں سے پاک ہونا چاہیے۔

دینی مدارس کے فضلاء کے روزگار کا مسئلہ:

معیشت زندگی کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اسلامی تعلیمات میں بھی اس کی اہمیت موجود ہے۔ لہٰذا اسلام خود معاشی نظام پیش کر کے ایک مکمل ضابطہ حیات ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ فرد اور جماعت دونوں کے ذہن سے اس باطل نظریے کو ختم کرتا ہے کہ اخلاق اور مذہب کا تعلق معاشی زندگی سے نہیں جبکہ قرآن پاک بڑے بلیغ انداز میں معیشت اور اخلاق کا تعلق بیان کرتا ہے۔"مسلمانو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو تم اللہ کی یاد کی طرف دوڑو اور لین دین چھوڑ دو! اگر تم جانتے ہو تو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے پھر جب نماز ختم ہو جائے تو تم زمین پر پھیل جائو اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔"[24]

قرآن پاک میں متعدد مقامات پر معاش کو "فضل اللہ" کہا گیا ہے۔ اور یہ بات مقصود ہے کہ یہ سب خدا کی عنایت سے ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ معاشی زندگی کو بھی انسان اسی طرح خدا کی حدود کا پابند بنائے جس طرح باقی تمام زندگی کو اور ان مقاصد کی تحصیل کے لیے استعمال کرے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے اسلام نے مقرر کیے ہیں۔

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَ مِنَ الدُّنْيَا۔[25]"اور دنیا سے اپنا حصہ لینا نہ بھولو۔"

نبی اکرم ﷺ نے کسب حلال کو فریضۃ بعد الفریضۃ یعنی ایک فرض کی ادائیگی کے بعد دوسرا فرض قرار دیا ہے۔[26] اور بے عملی، بے روزگاری اور گداگری کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے جبکہ معیشت کو سب کے برابر رکھا ہے۔

وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ[27]

ترجمہ: اور ہم نے تمہارے لیے زمین میں معیشت کے سامان بنا دیئے اور ان کے لیے جن کو تم روزی دینے والے نہیں ہو۔

ان آیات میں بلا تخصیص ہر فرد وبشر کو خطاب ہے اور خدائے تعالیٰ کے خزانوں سے بخشش وفائدہ اٹھانے کا حق ہر ایک کو برابر ہے۔ مگر مدارس میں فارغ ہونے کے بعد طلبہ جو مولویوں کے بیٹے ہوں یا جن کے مدرسے ہوں وہ بالعموم باپ کی جگہ پر امامت وخطابت سنبھال لیتے ہیں اور کچھ اپنے وسائل دیکھ کر الگ مدرسہ کھول دیتے ہیں۔ کچھ مساجد میں امام وخطیب بن جاتے ہیں۔ جو ذہین وفطین ہوں وہ مدارس میں استاد بن جاتے ہیں۔ کچھ طلبہ جنہوں نے خوش نویسی کتابت وغیرہ سیکھی ہو وہ ان شعبوں کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ سرکاری اداروں میں معلم

عربی یا گھریلو معلم قرآن کی حیثیت سے ملازمت ملنے کے امکانات بھی ہوتے ہیں۔[28] مگر اس کے علاوہ ان کی معاشرے میں کوئی دیگر کھپت (Scoup) کی شکل نہیں اور انہیں بھی معاشرے کے شعبوں کی کچھ معلومات نہیں ہوتی۔ لہٰذا پوری زندگی دین کو دینے کے باوجود معاشی طور پر وہ ایک معمولی دکاندار کے برابر تو کجا بعض اوقات اس کے دست نگر ہوتے ہیں۔

عوام علماء کے علم و بلند کرداری اور دینی شعور کے مقابلے میں معاشرے کے جاگیر دار، کارخانہ دار، چودھری، افسر، تاجر کو زیادہ اہمیت اور بااختیار سمجھتے ہیں۔ یوں معاشرے میں مدارس اور ان سے وابستہ علماء کا مقام وہ نہیں رہتا جس کے وہ اہل ہیں۔ عام لوگ اپنی اولاد کو جو ذہین و لائق ہو اسکول و کالج کی راہ دکھاتے ہیں جبکہ کمزور اور جسمانی و ذہنی طور پر پسماندہ بچوں کو مدارس و مسجد کے سپرد کر دیتے ہیں اور اس رجحان کے پیش نظر مدارس میں اعلیٰ صلاحیتوں کی کمی دیکھی جاسکتی ہے۔[29] جبکہ اسلامی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ علماء کا کاروبار و تجارت سے ہمیشہ واسطہ رہا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کپڑے کا کارخانہ رکھتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ زمین پر کاشتکاری کرتے تھے اور اکثر علماء کے ناموں کے ساتھ ان کے پیشوں کے نام لکھے جاتے تھے جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ تعلیم کے علاوہ روزگار میں حصہ ہماری روایت کے خلاف نہیں رہا۔ ابو بکر جصاص (چن بزیا چونا فروش)، ابو علی دقاص (آٹا فروش)، امام قدوریؒ (ہانڈی فروش) اور شمس الائمہ قفال (تالہ بنانے والے)، ان کے علاوہ (حلوائی) عطار عطر فروش، صغار (تانبے کے برتن بیچنے والے وغیرہ) علماء کا ذکر ملتا ہے۔ متاخرین میں شاہ عبد القادر دہلوی فارغ وقت میں گھر بیٹھ کر ریشم سلجھایا کرتے تھے اور روزی کماتے تھے۔ اساتذہ خود مختلف مساجد میں مختلف اوقات میں علوم و فنون کی تعلیم دیتے تھے۔ (Visting Teacher) کی حیثیت سے کیونکہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے سے تعلیم کے نظام کی بحالی کے ساتھ اساتذہ کی تنخواہیں مقرر تھیں جو بیت المال سے ادا ہوتی تھیں۔[30]

مندرجہ بالا پیرائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت دینی مدارس کی تعلیم، روزگار کے اعلیٰ مواقع حاصل کرنے میں معاونت نہیں کررہے مساجد میں فقط آئمہ یا خطیب بنا رہے ہیں۔ اس طرح پاکستان میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد قومی دھارے میں شریک ہونے سے محروم رہ جاتی ہے۔ دوسری طرف وہ خود معاشرے میں کوئی معاشی روزگار حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔

اس وقت اگر 20 لاکھ بچے مدارس میں حفظ و ناظرہ کے درجات میں ہیں مگر دو کروڑ بچے پرائمری سکول میں ہیں۔ اب یہ کون سا دین ہے جو ان 20 لاکھ بچوں کو پڑھایا جاتا ہے مگر باقی دو کروڑ کو نہیں... اس کا مطلب ہے کہ ہم دو لاکھ بچوں سے صرف مدرسے کے مولوی ہی پیدا کررہے ہیں جن کا ملک چلانے والے باقی عہدوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو انگریزوں کی چال تھی جو انہوں نے قیام ہندوستان میں مسلمانوں کو حکومت سے دور رکھنے کے لیے چلی تھی۔[31]

مندرجہ بالا پیرائے سے یہ صورت حال واضح ہوتی ہے کہ ان اداروں کو حکومت کی کوئی سرپرستی حاصل نہیں ہے۔ ان مدارس کو وزارت مذہبی اُمور کے سپرد کیا ہوا ہے جو امن و امان کی ذمہ دار ہے یا زکوٰۃ کی مد میں انہیں چند لاکھ روپے مل جاتے ہیں بلکہ اس اشک شوئی میں بھی بہت سے حضرات نام نہاد دینی مدارس کے نام پر اپنا حصہ بٹورتے رہے ہیں۔ محکمہ اوقاف، مزاروں اور مجاوروں کی خدمت تو کرتا ہے، مگر دینی تعلیم کی سرپرستی کی کوئی ذمہ داری ان پر عائد نہیں ہوتی۔

بیرون ملک سے مالی امداد پر اعتراضات اور حقیقت:

چندے کے حصول میں مدارس کو بیرون ملک سے ملنے والی امداد بھی قابل ذکر ہے کیونکہ اس ضمن میں حکومت اور غیر اسلامی حلقوں سے مختلف قسم کے اعتراضات و الزامات سننے کو ملتے ہیں۔ حکومتی امداد پر عتراض: یہاں ہارورڈ یونیورسٹی کے کینڈی اسکول آف گورنمنٹ کی تحقیق کار ڈاکٹر جیسکا سٹرن (Dr.Jessica Stern) کے مضمون سے ان مرکزی جملوں کو نقل کرکے تبصرہ کیا جارہا ہے۔ جن میں مدارس کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

پاکستان میں دینی مدارس جہادی عنصر کی ترقی کا ذریعہ ہیں۔ یہ مدرسے جنرل محمد ضیاء الحق کے زمانے میں اس لیے تیزی سے پھلے پھولے کیونکہ انہیں حکومتی سطح پر زکوٰۃ فنڈ سے مالی مدد ملتی تھی۔[32] اس اعتراض کا جواب "سلیم منصور خالد" ان الفاظ میں دیتے ہیں کہ:

"دینی مدارس کی ترقی کے لیے صدر محمد ضیاء الحق کے عہد میں زکوٰۃ فنڈ کو مدارس کی توسیع کا بڑا محرک قرار دینا غیر منطقی اور غیر حقیقی نظریہ ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ اس دوران ہی نہیں بلکہ آج تک بھی تقریباً آدھے سے کم مدارس کو زکوٰۃ کی مد میں رقم ملتی ہے۔ اس امدادی رقم کا فی مدرسہ سالانہ تناسب دس سے بیس ہزار روپے کے درمیان رہا ہے۔ یعنی سال بھر میں تقریباً ۱۳۰ سے ۳۵۰ ڈالر بنتی ہے۔ جبکہ دینی مدارس کی روایت کے مطابق اس نے طالب علم کو رہائش، خوراک، تعلیم، کتب اور دیگر ضروریات کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ اس لمبے چوڑے بکھیڑے کے ساتھ ساتھ بانی یا مہتمم کا کچھ معمولی معاشی مسئلہ بھی حل ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مدرسہ کی تشکیل صدر ضیاء الحق کے عطا کردہ معمولی زکوٰۃ فنڈ کے بل پر نہیں بلکہ جذبے کی بناء پر ہوئی۔[33] البتہ سلفیہ مدارس کو سعودی حکومت اور شیعہ مدارس کے لیے ایران سے ضرور امداد آتی ہے جس کو مثال بنایا جاتا ہے۔ جیسا کہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ان مدارس کو دوسرے ممالک میں مقیم پاکستانی محنت کش باشندوں اور کچھ مخیر حضرات سے مالی معاونت ملتی ہے جس کے لیے مدارس کے بانیان یا ذمہ داران کو خود کوشش کرنی پڑتی ہے۔

گذشتہ دنوں اخبارات میں اس خبر کو خوب پذیرائی ملی جب تاریخ میں پہلی مرتبہ خیبر پختونخوا حکومت کی جانب سے ممتاز دینی درسگاہ "دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک" کیلئے 30 کروڑ روپے کی گرانٹ مختص کی گئی۔ اس پر مختلف سیاسی جماعتوں کی جانب سے تنقید کا سلسلہ جاری ہوا جن میں خود مولانا فضل الرحمن بھی شامل ہیں جبکہ وہ خود اس مدرسے سے فارغ التحصیل ہیں۔ روزنامہ نیشن (Nation) میں 27 جون 2017ء کو یہ سرخی لگی: "دارالعلوم حقانیہ کے لیے 30 کروڑ امداد طالبان کو جواز فراہم کرنے کے سوا کچھ نہیں "زرداری" مدرسہ کے سربراہ طالبان کے ہمدرد، ان کے غیر اعلانیہ ترجمان بھی ہیں۔ خیبر پختونخوا کی حکومت کا اقدام تشویشناک ہے۔ سابق صدر[34] جبکہ اس خبر کے جواب میں خیبر پختونخوا کی حکومت کا یہ موقف سامنے آیا ہے کہ اس قدیم درسگاہ کو جہاں سے ہر سال پندرہ سو سے زائد طالب علم فارغ التحصیل ہوتے ہیں اور بیشتر فضلاء مختلف یونیورسٹیز کے اسلامک اسٹڈیز کے سربراہان ہیں۔ جبکہ پاکستان کے سب سے بڑے اس مدرسے کے اخراجات یہ مدرسہ خود برداشت کرتا ہے جبکہ وزیر اعلیٰ پنجاب حکومتی فنڈ سے تعلیمی اداروں اور پنجاب اور ملک بھر میں خطیر رقم سے لیپ ٹاپ اسکیم چلا رہے ہیں جس کا کوئی موازنہ اس امداد سے نہیں کیا جاسکتا۔ یہ امداد صرف اس مدرسے کو Main Stream یعنی قومی دھارے میں شامل کرنے کیلئے ہے۔[35]

اس طرح روزنامہ پاکستان 02 جنوری 2016ء میں یہ خبر شائع ہوئی کہ:

مشتبہ مدارس کے اکاؤنٹس خالی ہیں اور حکام پریشان، اخراجات کے بارے میں پوچھ گچھ کا فیصلہ۔ صوبہ میں دو سو مشتبہ مدارس کے بینک کھاتوں سے کوئی اہم ٹرانزکشن سامنے نہ آسکی۔ چند ہزار سے زائد رقم موجود نہ تھی۔"[36]

اس موضوع پر علامہ خلیل الرحمن قادری اپنے ایک مکتوب میں یوں تبصرہ کرتے ہیں: اس قسم کے بیانات آئے دن اخبارات کی زینت بنتے ہیں۔ مگر خود ایجنسیوں کی زیر قیادت بنائے جانے والے مدارس کے سوا کسی بھی قدیم مدارس پر ایسا کوئی الزام ثابت نہیں کیا جاسکا۔ حالانکہ دینی مدارس کے ساتھ حکومتی ناانصافی ہمیشہ سے جاری ہے اور کس مپرسی کے عالم میں محض چند مخصلین اہل ثروت اور ایثار کیش علمائے کرام کے تعاون سے یہ مدارس چل رہے ہیں۔ حکومت کسی بھی مدرسہ کے قیام کیلئے نہ کوئی قطعہ اراضی فراہم کرتی ہے اور نہ تعمیرات میں تعاون کرتی ہے بلکہ حد تو یہ ہے کہ زکوٰۃ فنڈ میں سے جو رقوم مختص کی جاتی ہیں وہ بالعموم مختلف حیلے بہانوں سے روک لی جاتی ہیں۔ آج بھی حکومت کی وزارت مذہبی اُمور کے پاس کروڑوں روپے کے فنڈز اس مد میں منجمد ہیں۔ اس کے باوجود لاتعداد طلباء مدارس سے اکتساب کر رہے ہیں۔[37]

دینی مدارس، معاش کی فراہمی اور دینی و عصری تعلیم:

ہمارے مقتدر حلقوں کی جانب سے دینی مدارس کو بھی روایتی این جی اوز کا ہی ایک نیٹ ورک سمجھا جاتا ہے۔ جہاں ہزاروں دینی مدارس ملک بھر میں لاکھوں طلبہ اور طالبات کو مفت تعلیم فراہم کر رہے ہیں۔ اس طرح یہ مدارس حدیث پاک کے مطابق:

تؤخذ من اغنیائھم فترد علی فقرائھم[38]

ترجمہ: زکوٰۃ معاشرے کے مال دار حضرات سے لی جاتی ہے اور فقراء کو لوٹا دی جاتی ہے۔

اس کا عملی نمونہ پیش کرتی ہے۔ چنانچہ اصحابِ خیر کے مدارس پر اعتماد سے آنے والی رقوم سے مدارس کا نظام چل رہا ہے کیونکہ عام آدمی کا یہ شعور ہے کہ دینی تعلیم کی اصل درسگاہ یہی دینی مدارس ہیں جہاں عاقبت سنواری جاتی ہے۔ جبکہ باقی علوم کو وقت کا ضیاع اور دنیا کے حصول کا ذریعہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ بانی و مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ کے معروف استاد مولانا عبدالحق ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں: "تعلیم کا مقصد معاش کمانا نہیں ہے ہمارے ہاں تصور یہ ہے کہ دین کو سیکھیں۔ اس پر عمل کریں اور اس کی اشاعت کریں نہ کہ اس سے معاش کمانے کی کوشش کریں۔"[39]

جس علم کا حاصل ہے جہاں میں کف جو وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں

دراصل ہماری دینی روایات میں معاش کی فکر نہ کرنے کا رجحان نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے فقر اختیاری اور کار نبوت کی مصروفیات کی وجہ سے معاشی جدوجہد نہ کرسکنے اور بعض صوفیاء کے طرز عمل کی بناء پر اس کے برعکس بھی ہے۔ لیکن ہمارے علم کی حد تک جمہور کی رائے میں یہ ایک موقف ہے کیونکہ صحیح احادیث میں نبی کریم ﷺ نے معاشی جدوجہد کو عین دینی کام اور جہاد فی سبیل اللہ قرار دیا ہے۔ صحابہ کرامؓ کا طرز عمل بھی یہی تھا کہ وہ کسب رزق سے تساہل کو معیوب گردانتے تھے۔ سوال کرنے کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ پر خلافت کی ذمہ داری ڈال دی گئی تو اس کے باوجود آپ دوسرے دن تجارت کے لیے بازار پہنچ گئے تو صحابہ کرامؓ نے انہیں منع کیا اور بقدر ضرورت ان کا وظیفہ مقرر کر دیا تاکہ وہ معاشی سرگرمی سے باز رہیں اور سارا وقت خلافت کے کاموں کو دیں۔ حضرت عمرؓ کا وہ جملہ تو تاریخ

میں زبان زد عام ہے کہ "اگر دجلہ کے کنارے ایک بکری کا بچہ بھی بھوک سے مرتا ہے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔" یہ اولی الامر اور راعی کی ذمہ داری ہے اور علماء کرام جانتے ہیں کہ "اولی الامر اور راعی میں صرف حکمران ہی شامل نہیں بلکہ قبیلوں کے شیوخ، خاندان اور اداروں کے سربراہ اور علماء کرام بھی اس میں شامل ہیں۔"[40] لہٰذا ہماری رائے میں وفاقوں اور اداروں کے سربراہ دینی مدارس کے مہتمم حضرات کی یہ اخلاقی اور شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے طلبہ کے روزگار کے بارے میں سوچیں۔ یہ ہرگز غیر مرغوب و غیر مطلوب یا مکروہ سعی نہیں ہے۔[41]

حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ اور حضرت حسین بن علیؓ کی شہادت کے بعد اُمت کے اہل علم و صلاح نے یہ فیصلہ کیا جس پر علماء اُمت کا عملاً اجماع ہو گیا کہ انہوں نے حکومت و سیادت سے صرف نظر کرتے ہوئے تعلیم و تزکیہ کا میدان سنبھال لیا اور مساجد و مدارس اور رباط اور زاویے کے مرکز نگاہ بن گئے اور فقہ و افتاء (عدالت کا نظام) بارہ سو سال تک علماء کے ہاتھ میں ہی رہا ہے۔ لہٰذا دینی مدارس کو آج بھی اپنے طالب علموں کے معاشی مستقبل کی منصوبہ بندی کر کے عمل درآمد کرنا ہو گا۔ حکومت کی طرف انحصار کرنے سے بہتر ہے کہ وہ ایک لائحہ عمل پر غور کریں۔[42]

ڈاکٹر محمد امین (مدیر ماہنامہ البرہان) اس سلسلے میں بہت واضح حکمت عملی پیش کرتے ہیں جن میں سے چند تجاویز درج ذیل ہیں: دینی مدارس اور ان کے وفاق اپنے مقصد تعلیم پر نظر ثانی کریں اور اس روایتی فکر کو بدلیں کہ ان کا کام صرف مدارس و مساجد کے افراد تیار کرنا ہے۔ یہ ایک عظیم مقصد ہے۔ فجزاھم اللہ عنا و عن جمیع المسلمین خیر الجزاء۔ اب ایسے افراد تیار کرنا ہے جو نہ صرف مساجد و مدارس کو آباد رکھیں بلکہ وہ معاشرے اور ریاست کے اداروں کے لیے بھی بہترین کارکن ثابت ہوں۔ وہ اسلامی اخلاق اور سلوک کا مظاہرہ کریں اور معاشرے و ریاست اور ان کے اداروں کو سیکولر جدید ذہن کے افراد کے سہارے پر چھوڑنے کی بجائے خود اسے اسلامی کردار کے ساتھ اور اسلامی تناظر میں چلانے کی کوشش کریں۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان شاء اللہ اس کے بہت سے مثبت اور مفید اثرات اس ملک اور معاشرے پر پڑیں گے اور علمائے کرام عند اللہ ماجور بھی ہوں گے۔

اگر مذکورہ بالا مقصد حاصل کرنا ہو تو دینی مدارس اور ان کے وفاقوں کو موجود نصاب اور نظام پر نظر ثانی کرنا ہو گی جس کا تعلق رائے اور تدبیر (شرعی اصطلاحات میں اجتہاد اور سیاسہ شرعیہ) میں ہے۔ ہم بطور تجویز ایک نقشہ اور منصوبہ دینی مدارس کے وفاق کے سامنے غور و فکر کے لیے پیش کرتے ہیں۔

1: مدارس کا موجودہ ڈھانچہ یہ ہے کہ وہ آٹھ سال میں ثانویہ عامہ، خاصہ، عالیہ اور عالمیہ کرواتے ہیں۔ عالمیہ کے بعد بعض بڑے مدارس میں چھ ماہ سے دو سال تک تخصص کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ اس نظام پر نظر ثانی کرتے ہوئے ہمارے رائے میں یہ ہے کہ اسے مندرجہ ذیل شکل دی جائے۔

2: ابتدائیہ (چھ سال) اور متوسط (تین سال) یعنی پرائمری اور مڈل تک دینی مدارس سکول کی تعلیم کو اپنی ذمہ داری سمجھیں۔ حکومتی نصاب میں اپنی طرف سے دینی مواد کا اضافہ کریں اور بچوں کی اسلامی لحاظ سے ذہن سازی اور تربیت کریں۔ یہ عمر کا وہ حصہ ہوتا ہے جہاں بچے کی شخصیت بنتی ہے۔ دینی مدارس اگر اس مرحلے کی تعلیم کو کنٹرول کر لیں اور مسلمان بچے کی صحیح اور متوازن تربیت کر دیں تو سمجھئے انہوں نے

جنگ جیت لی۔

3: باقی مراحل تعلیم میں چار سالہ ثانویہ (عامہ خاصہ یا میٹرک، ایف) چار سالہ گریجوایشن (عالمیہ وعالیہ یا بی ایس یا بی اے، ایم اے) اور دو سالہ ماسٹرز (ایم فل) اور چار سالہ پی ایچ ڈی شامل ہیں۔ یہ 22، 23 سالہ دورانیہ خاصا طویل ہے اس میں بہت کچھ ہو سکتا ہے اور اگر دینی مدارس کے طلبہ دو گروپ بنالیں۔ ایک علوم اسلامیہ میں تخصص یعنی ماہر علماء تیار کرنے کا اور دوسرا عمرانی علوم و سائنسی علوم کے طلبہ کا۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ ترجیحاً عمرانی علوم کے طلبہ سنبھال لیں کیونکہ عمرانی علوم افراد کی ذہن سازی اور تربیت میں مقابلتاً زیادہ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ سائنسی و فنی علوم کی اہمیت بھی اپنی جگہ ہے لیکن نظریاتی لحاظ سے ان کی اہمیت نسبتاً کم ہے اور ان کے انتظامی اخراجات بھی بہت زیادہ ہوتے ہیں۔[43]

اس کے علاوہ ثانویہ میں تخصص کی ابتداء کر دی جائے اور دینی مدارس علوم دینیہ کے علاوہ عمرانی علوم اور (بعض مالی طور پر مضبوط دینی مدارس) اگر ہو سکے تو سائنس گروپ کے طلبہ کو بھی داخلہ دیں۔ یعنی دینی علوم کے طلبہ عمرانی و سائنسی علوم کا تعارفی مطالعہ بھی کریں اور عمرانی و سائنسی علوم کے طلبہ منتخب دینی علوم کا مطالعہ کریں۔ اگر یہ کام دینی مدارس خود نہ کر سکیں تو حکومت یعنی وفاق المدارس کے علماء اور ماہرین تعلیم کو یکجا ہو کر کرنا چاہیے۔ اس طرح دینی مدارس کی ڈگریاں آسانی سے حکومتی ڈگری ہی دلوا دیں۔ اگر نصاب ایسا ہو جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔[44]

فوائد:

اس تجویز کا عملی فائدہ یہ ہو گا کہ: دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ نہ صرف مساجد میں امام و خطیب کام کر سکیں گے بلکہ دینی مدارس میں بطور استاد پڑھا سکیں گے۔ بلکہ نجی اور سرکاری دفاتر میں بھی کام کر سکیں گے۔ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھا سکیں گے اور تجارت، صنعت و حرفت میں چھوٹے یا بڑے پیمانے پر بطور منتظم یا مالک کام کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں گے۔ ملک کی معاشرتی و معاشی زندگی میں علماء کرام کو زیادہ بہتر متوازن اور مؤثر کردار ادا کرنے کا موقع ملے گا۔ معاشرے سے دین و دنیا کی تفریق ختم ہو جائے گی۔ جو غیر اسلامی ہے۔ عملی زندگی میں شرکت سے عام لوگوں کے ساتھ معاملات کے نتیجے میں علماء کرام میں وسعت نظر پیدا ہو گی اور معاشرے کو پہلے سے بہتر انداز میں سمجھنے کے قابل ہوں گے اور لوگوں کے مسائل کو بہتر انداز میں سمجھ کر ان کے شرعی مسائل کے حل پیش کر سکیں گے۔ دینی مدارس کے فضلاء کے لیے روزگار کے وسیع مواقع پیدا ہوں گے تو لوگوں کا رجحان ان مدارس کی طرف اور زیادہ ہو گا اور ان کی نظر میں دینی مدارس کی اہمیت، ضرورت اور افادیت مزید بڑھ جائے گی۔ جس سے مدارس کے نظام میں بہتری اے گی.[45]

حکومت سے مطالبات:

دینی مدارس کے نظام کو رضاکارانہ تبدیلی کے ساتھ ساتھ دینی مدارس کے وفاقوں کو حکومت کے ساتھ ٹھوس ایجنڈے کے ساتھ مذاکرات کرنے چاہئیں تاکہ حکومت: دینی مدارس کی ڈگریوں کو تسلیم کرے۔ انہیں مالی معاونت مہیا کرے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نظام کی اصلاح کے طرز پر اسلامی تعلیمی اداروں کے لیے عمارت و زمین کو حکومتی ذمہ داری سمجھئے اور ہر کمیونٹی میں ایسا مدرسہ قائم کرے جس کی

گرانٹ حکومت سالانہ بجٹ کے موقع پر مختص کرے۔(بچوں کے ناظرہ قرآن کے سنٹر اس سے مستثنیٰ ہیں)۔جس کی نگرانی علماء کرام،ماہرین تعلیم،حکومتی نمائندے اور کمیونٹی کے افراد کریں۔جو خود ایک کمیشن ہو باقی ماہانہ خرچ اپنی مدد آپ کے تحت پورا کیا جائے۔اس طرح موئثر نتائج نکل سکتے ہیں۔[46]

قومی وعالمی سطح پر دینی مدارس کے آزادانہ معاشرتی کردار کو جن خطرات کا سامنا ہے اُن سے نمٹنے کے لیے سر فہرست معاشی مسائل نصاب وروزگار کے مسائل کو مدارس کے اکابر علماء کرام اور وفاقوں کے ذمہ داروں کو ملکران امور کا جائزہ لینا چاہیے۔ورنہ اقبال کے اس شعر کی صورت صلاحیتوں سے محروم نوجوانوں کو ہم مزید پیچھے دھکیل دیں گے۔

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے نمناک

نہ زندگی نہ محبت،نہ معرفت نہ نگاہ[47]

مصادرومراجع

[1] التحریم6:66

[2] مولانا عبدالہادی اعظمی ندویؒ،"مدارس اسلامیہ مقاصد وضرورت"دارالاشاعت کراچی،2014ء ص125

[3] أخرجہ البخاری فی التاریخ الکبیر،دارالکتب العلمیہ،بیروت،حدیث:رقم2682

[4] النسائی،احمد بن شعیب بن علی فی السنن الکبریٰ،دارالاسلام،الریاض حدیث رقم7482

[5] سلیمان ندوی"مسلمانوں کی آئندہ تعلیم"دارالمصنفین اعظم گڑھ،1980ء،ص126

[6] فیروآبادی،"قاموس المحیط،المبعتۃ المصر،1933ج2،ص215

[7] ابن منظور،افریقی،لسان العرب،دار صادر،بیروت1956"مادہ درس"،ص1120

[8] ڈاکٹر عبدالرحیم،"اسلامی جامعات'تاریخ،نظام واثرات،ادارہ تعلیم وتحقیق لاہور1986،ص142

[9] ثعلبی،"فقہ اللغۃ"،ص301

[10] ڈاکٹر عبدالرحیم،اسلامی جامعات،ص144

[11] سید محمد سلیم،"ھندوپاک میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت"اسلامک پبلی کیشنز لاہور،1980ء،ص7

[12] احمد شلبی،تاریخ تعلیم وتربیت،ادارہ ثقافت اسلامیہ،52

[13] الاحقاف4:46

[14] مولاناوحیدالدین"الرسالۃ"مارچ2012ء

[15] قریشی محمد مختار"تاریخ اسلام"پنجاب کتاب گھر،لاہور،1988ء،ص119

[16] سلیم محمد سید،پروفیسر"مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت"ادارہ تعلیم وتحقیق لاہور1997ء،40

[17] گیلانی مناظر احسن مولانا"پاک وہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت"،ص223

[18] ایضاً،ص226

[19] حافظ نذر احمد، "جائزہ مدارس عربیہ مغربی پاکستان"، 1971ء، ص684

[20] علامہ اقبال، بانگ درا، مشکوٰۃ، ص150

[21] پاکستان میں دینی مدارس، توقعات و چیلنج، مولانا ابو عمار زاہد الراشدی، ماہنامہ ترجمان القرآن، ستمبر 2017ء، ص68

[22] روزنامہ پاکستان "لاہور"، 13-اپریل 2016ء

[23] گلزار احمد مظاہری، مولانا، انٹرویو ممتاز احمد "دینی مدارس"، ص21-23

[24] وارث مظہری، ڈاکٹر، ہندوستان میں مدارس کا تعلیمی نظام، گلوبل میڈیا پبلی کیشنز نئی دہلی، 2014ء، ص168

[25] مفتی رشید احمد میواتی، "حیات مسیح الامت" میوات ادارہ تالیفات مسیح الامت 1995ء، ص569

[26] الجمعہ 62:9-10

[27] القصص 28:77

[28] کنز العمال، الہندی، کتاب البیوع، باب فی الکسب، ص4-5

[29] الحجر 15:20

[30] عبد الحق، مولانا، انٹرویو ممتاز احمد "دینی مدارس"، ص76

[31] حافظ حسین مدنی، مدیر "ماہنامہ محدث" لاہور، انٹریو ممتار احمد "دینی مدارس"، ص154

[32] سلیم، محمد، سید، پروفیسر، "عہد اسلامی کے عظیم مدارس"، ص12-13

[33] شبیر احمد میواتی، "دینی مدارس اور عصر حاضر" اشرفیہ اکیڈمی گوجرانوالہ، 2007ء، ص87

[34] M.Farooq,Dr.Education System of Pakistan for Promotion of reform and innovation in education, Islamabad, Asia society 1994, P.122.

[35] سلیم منصور خالد، "دینی مدارس میں تعلیمی کیفیت" انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد، ص150

[36] "ڈیلی نیشن" نیوز پیپر، پاکستان، 23جون 2016ء

[37] ایضاً، 26ون 2016ء

[38] روزنامہ پاکستان، 2جنوری 2016ء

[39] ارشاد احمد حقانی، "کالم: دینی مدارس اور ان کی مہم اسلام" مکتوب از علامہ محمد خلیل الرحمن قادری، ناظم جامعہ اسلامیہ لاہور، روزنامہ جنگ، 21جون 2006ء

[40] ابو دائود، کتاب الزکوۃ، حدیث 1362

[41] عبد الحق، مولانا، انٹرویو ممتاز احمد "دینی مدارس"، ص76

[42] مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، ڈاکٹر محمد امین "مدارس کے علماء کے روزگار کا مسئلہ"، ماہنامہ البرہان، اگست 2015ء، ص9

[43] ایضاً

[44] مولانا ابو عمار زاہد الراشدی "دینی مدارس کے اخراجات کا سرچشمہ"، ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن، ستمبر 2017ء، ص70

[45] ڈاکٹر محمد امین، "دینی مدارس اور وفاقوں کے لیے راہ عمل" ماہنامہ البرہان، اگست 2015ء، ص11-12

[46] ایضاً

[47] بانگ درا